حکمتِ سیّد مودودیؒ

کامیاب زندگی کا صحیح تصوّر

اقتباس کردہ:۔ محمد یوسف صاحب ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

اس مرتبہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ایسی تحریر برآمد ہوئی جو ہمارے ناقص علم کے مطابق اب تک اپنے حلقے کے لٹریچر یا جرائد میں نہیں آئی۔ عنوان بھی دلچسپ ہے اور اس میں مولانا نے دعوتِ اسلامی کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ (ادارہ)

کامیاب زندگی کا کوئی تصوّر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود زندگی کا کوئی تصوّر قائم کر لیا جائے۔ کیونکہ اسی پر کامیابی کا تصوّر مبنی ہو سکتا ہے۔ ایک تصورِ حیات کے لحاظ سے ایک زندگی انتہائی کامیاب قرار پاتی ہے، تو دوسرے تصورِ حیات کے لحاظ سے وہی زندگی انتہائی ناکام ٹھہرتی ہے۔ دُنیا کو ایک چراگاہ یا خوانِ یغما سمجھیے تو وہ شخص بہت کامیاب ہے جو اس تھوڑی سی مہلتِ عمر میں خوب عیش کر لے، اور وہ بڑا ہی نامراد ہے جو نفس و جسم کے ابتدائی مطالبات بھی اچھی طرح پورے نہ کر سکے۔ دُنیا کو ایک گزرگاہ سمجھیے تو کامیاب آدمی وہ ہے جو اس کشمکش کے میدان میں سب کو روندتا کچلتا آگے بڑھتا چلا جائے، یہاں تک کہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں اس کے جیتے جی کوئی حریف اس کی آرزوؤں کی تکمیل میں مزاحم ہونے والا نہ رہ جائے۔ اور اس کے برعکس وہ آدمی بالکل ہی ناکام ہے جو اپنی اغراض کے لیے کسی ایک بندۂ خدا سے بھی چھین جھپٹ نہ کرے اور سفرِ حیات میں کبھی دو ہمراہیوں کو بھی کہنی مار کر آگے نہ نکلے۔ لیکن اگر آپ کا تصورِ حیات ان تصوّرات سے مختلف ہو تو کامیابی و ناکامی کے متعلق بھی آپ کا تصوّر ان سے مختلف ہو جائے گا۔ اتنا مختلف کہ آپ ان

لوگوں کو سخت ناکام و نامراد سمجھیں گے جو ان تصورات کے لحاظ سے بڑے کامیاب ہیں اور ایسے لوگوں کو انتہائی کامیاب قرار دیں گے جو ان کے لحاظ سے قطعی ناکام ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کامیابی و ناکامی کا کوئی ایک متعین معیار نہیں جو دنیا بھر میں مسلّم ہو، بلکہ مختلف لوگوں کی نگاہ میں اس کے مختلف معیار ہیں۔ اور ان معیاروں کو متعین کرنے میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو، اور اس دنیا کو جس میں وہ رہتا ہے، اور اس مہلتِ عمل کو جو اسے یہاں حاصل ہے، کیا سمجھتا ہے؟

طولِ کلام سے بچتے ہوئے میں اختصار کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ ایک سچے مسلمان کی نگاہ میں فلاح و خسران کا حقیقی معیار کیا ہے۔ یہ معیار اسلام نے پیش کیا ہے اور ہمیشہ سے اہلِ ایمان اسی کے لحاظ سے رائے قائم کرتے رہے ہیں کہ فائز و کامران کون ہے اور خائب و خاسر کون۔

زندگی کا جو تصور اسلام ہمیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا ہے۔ تاکہ انسان یہاں اس کے دیے ہوئے سروسامان اور اس کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر اپنی اصلی قدر و قیمت کا اظہار کرے۔ اس تصور کی رو سے دنیا کوئی چراگاہ یا رزم گاہ نہیں ہے، بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ جس چیز کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں، وہ دراصل وہ وقت ہے جو امتحان کے پرچے کرنے کے لیے ہم کو دیا گیا ہے، اور امتحان کے پرچے بے شمار ہیں۔ ماں باپ، اولاد، بیوی، شوہر، بھائی بند، رشتہ دار، دوست، ہمسائے، قوم، وطن اور پوری انسانیت جس کے ساتھ طرح طرح کے تعلقات و روابط میں انسان بندھا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اپنی معاش کے سلسلے میں اور جن جن طریقوں سے بھی انسان کام کرتا ہے اور پھر اس کمائی کو جس جس طرح خرچ کرتا ہے، یہ سب بھی امتحان ہی کے مختلف پرچے ہیں۔ اسی طرح جتنی قابلیتیں اور قوتیں اللہ نے اس کو دی ہیں، جو جو خواہشیں اور میلانات اور جذبات اس میں رکھے ہیں، ان جن جن ذرائع اور وسائل سے کام لینے کی اس کو قدرت عطا کی ہے، ان سب کی اصل حیثیت بھی امتحان کے پرچوں ہی کی ہے اور سب سے بڑا پرچہ اس مضمون کا ہے کہ اپنے اس خالق کے ساتھ انسان کیا رویہ اختیار کرتا ہے، جس کی دنیا میں وہ رہتا ہے، جس کی دی ہوئی قوتوں اور طاقتوں سے وہ کام لیتا ہے، اور جس کے بخشے ہوئے سروسامان کو وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر امتحان ہے، جس کی لپیٹ میں زندگی کا ہر پہلو آیا ہوا ہے اور ہمہ وقتی امتحان

ہے جس کا سلسلہ ہوش سنبھالنے کے وقت سے موت کی آخری ساعت تک جاری رہتا ہے۔

اِس امتحان گاہ میں اصلی اہمیت اس چیز کی نہیں ہے کہ آپ کس مقام پر، کس حیثیت میں امتحان دے رہے ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو شخص یہاں مزدور کی حیثیت سے اٹھ کر ایک بڑا کارخانہ دار، یا رعیّت کے مقام سے بلند ہو کر ایک بڑا فرمانروا بن گیا ہے، اُس نے درحقیقت کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے، بلکہ امتحان کے بہت سے زائد پرچے اُس پر تھوپ لیے ہیں اور پہلے کی بہ نسبت وہ زیادہ سخت پرچے لے کر بیٹھ گیا ہے، جہاں نمبر زیادہ پانے کے جتنے امکانات ہیں، اتنے ہی زیادہ ناکامی کے خطرات بھی ہیں۔

یہ امتحانی تصورِ حیات جس شخص کا بھی ہو، اس کا معیارِ کامیابی و ناکامی لازماً دوسرے تصوراتِ حیات رکھنے والوں کے معیار سے بالکل مختلف ہوگا۔ اس کے نزدیک اصل کامیابی خدا کے اس امتحان میں ایک بندۂ وفادار و شکرگزار ثابت ہونا ہے۔ ایک ایسا بندہ ثابت ہونا ہے جس نے خدا کے اور بندوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک سمجھے اور ادا کیے ہوں، جس نے دل اور نگاہ، کان اور زبان، پیٹ اور جنسی قوتوں کو بالکل پاک رکھا ہو۔ جس کے ہاتھوں نے کسی پر ظلم نہ کیا ہو، جس کے قدم بدی کی راہ پر نہ چلے ہوں، جس نے کم کمایا ہو یا زیادہ، مگر جو کچھ بھی کمایا ہو حق اور راستی کے ساتھ کمایا اور جائز راستوں میں خرچ کیا ہو۔ جو امانتوں کا محافظ، قول و قرار میں سچا اور عہد و پیمان میں راسخ رہا ہو۔ جو بھلائی کا دوست اور بُرائی کا دشمن ثابت ہوا ہو۔ جسے اس کے خدا نے جس حیثیت میں بھی رکھا ہو وہاں اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ سمجھا اور ادا کیا ہو۔ جس کا یہ حال نہ رہا ہو کہ بقول ظفرؔ:

ع۔ جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

یہ کامیابی جس کو نصیب ہوگئی، وہ بہر حال فائز المرام ہے، خواہ دُنیا میں وہ نانِ جویں تک کو محتاج رہا ہو اور کوئی اس کا کارنامہ تاریخ کے صفحات پر ثبت نہ ہو۔ اس کے برعکس جو اس کامیابی سے محروم رہ گیا وہ سخت نامراد ہے خواہ وہ دُنیا کے سرمایہ داروں کی صفِ اوّل میں پیشوائی کا مقام حاصل کر گیا ہو، یا فاتحینِ عالم کا سرخیل ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔

لاہور - ۲ جولائی ۱۹۵۸ء

(ماخوذ از "کامیاب زندگی کا تصوّر" مکتبہ جدید لاہور ۱۹۶۲ء)